پروفیسر خالد شبیر احمد　　　　قسط: ۳۷

ورق ورق زندگی

۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک:

۱۹۶۲ء میں صدر ایوب خان نے سیاسی جماعتوں سے پابندیاں اٹھائیں تو مجلس احرار اسلام کی تشکیل نو کا آغاز ہوا۔ ۶۲ء سے ۶۹ء تک احرار کی شیرازہ بندی اور تنظیم کا بھرپور انداز میں کام ہوا۔ جانشینِ امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاریؒ نے ملک بھر کے دورے کیے، اجتماعات منعقد کیے اور زبردست جدوجہد کی۔ مارچ ۱۹۷۰ء میں احرار پارک باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں آل پاکستان احرار کانفرنس منعقد کی گئی جو احرار اسلام کا نشانِ عروج تھا۔ یہ آٹھ سال کا عرصہ رہنمایان احرار اور رضا کارانِ احرار کے لیے انتہائی مشکل، صبر آزما اور تکلیف دہ تھا۔ ہر قدم پر مخالفت ایک کے بعد دوسرا امتحان، ہر امتحان میں اپنے اسلاف کا نقش قدم، استقامت اور جرأت کی تلقین و ترغیب کا باعث رہا۔ صبر اور ہمت سے ہر مشکل کے باوجود قافلہ اہل جنوں آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجلس احرار اسلام کی تاریخ کا ایک ایک ورق ایسی ہی مشکلات سے بھرا پڑا ہے لیکن مجال ہے کہ کہیں قدم رکے ہوں یا پھر حق بات کہنے سے گریز کیا ہو۔ جنھیں اپنے مؤقف کی صداقت پر لازوال یقین ہو وہ اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو کر ساری دنیا سے لڑ جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مجلس احرار اسلام کے نزدیک کامیابی و ناکامی کے معیار ہی مختلف ہیں۔

> ''کامیاب وہ ہے جس نے اپنا مشن نہیں چھوڑا۔ جو حق کے لیے جان دے دے مگر غداروں، جفاکاروں سے روشناسی کے لیے قوم کو بروقت بیدار کردے جو نونہالانِ وطن کو حقیقت کی راہ سجھائے اور قومی معاشرے کی تباہی سے بچانے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ دے۔ جو تاجدارِ ختم نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سے آخری بین الاقوامی قانون کے ساتھ مرتے دم تک غیر مشروط وابستگی رکھے۔
>
> وہ کامیاب نہیں جو قوم کا خون بہادے، عزتیں لٹوادے، اموال تباہ کردے۔ جو اسلام کا نام لے کر جمہوریت، اشتراکیت، مارکس ازم اور فاشزم، یہودیت اور مرزائیت کے لیے چور دروازے کھولے اور اسلامی آئین میں تحریف اور منافقت کی نقب لگائے۔ ایسا شخص کائنات کا، مسلمانوں کا، اسلام کا بدترین دشمن ہے۔''

یہ ہے اُن تقریروں کا خلاصہ جو ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ قوم کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ان آٹھ برسوں میں مجلس احرار اسلام کا یہی وہ مرکزی نصب العین تھا جو احرار رضا کاروں کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ کیسے

کیسے مراحل درپیش رہے۔ ملتان میں یوم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ منایا۔ کس حوصلے کی بات تھی۔ لیکن منایا گیا اور اس کے بعد جو حالات پیدا کر دیے گئے اُن کا مقابلہ بڑی دلیری اور ہمت کے ساتھ کیا گیا۔ ابوذر بخاریؒ قید ہو گئے، رہا ہوئے تو اُن کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے کہ جب وہ گھر آئے اور بیٹھک میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے سامنے اُنھوں نے خلیفہ راشد امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا وہ تاریخی قصیدہ پڑھ کر سنایا جو انھوں نے ملتان جیل میں لکھا تھا۔ اُن کا چہرہ آج بھی تصور میں میرے سامنے آتا ہے تو میرے ایمان ویقین کے لیے ثبات واستحکام کا باعث بنتا ہے۔ چہرہ کیا تھا، نورِ ایمانی کا دمکتا ہوا چاند تھا۔ جو ہر سننے اور دیکھنے والے کے دل ودماغ کو منور کر رہا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے:

''میرا وجدان گواہی دیتا ہے اور میں انشراح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلمان خوابِ غفلت سے نہ جاگا تو ذلیل وخوار ہوگا۔ اللہ کے وعدے کبھی جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی آیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے ماننے والوں کا کبھی بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ باقی رہی موت، یہ اگر شکست کی دلیل ہے تو ہزاروں انبیاء شہید ہو گئے اور اپنا ایک امتی بھی پیدا نہ کر سکے۔ بیرونی سازشوں میں شریک ہو کر سفارت خانوں سے حاصل کردہ سرمائے کو مانندِ آب بہا کر یا کوئی اور ناٹک رچا کر برسرِ اقتدار آ جانا حق کی علامت نہیں ہے اور نہ ہی کامیابی کی دلیل۔ یہ وقتی شعبدہ بازی ہے یا ایکٹروں کا کھیل ہے۔''

یہ اُن کی تقریروں کا لب ولہجہ تھا جس میں وہ ان آٹھ برسوں میں قوم کو خطاب کرتے رہے۔ اُس وقت ملک کے اندر جو سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا، وہ یہی تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا سوشلزم اپنے عروج پر تھا۔ یہ احرار ہی تھے جو اس کے سامنے ڈٹ گئے۔ مجھے کچہری روڈ پر مولانا سید عطاء المحسن بخاری کی کتابوں کی دکان ''بخاری اکیڈمی'' پر بھٹو کے جیالوں کا حملہ بھی یاد ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے جلوس کے گزرنے سے تھوڑی دیر پہلے کیا گیا تھا۔ یہ حملہ ایک ایسا بینر جو بھٹو کے اس وقت کے سیاسی نعرے کہ ''دین ہمارا اسلام ہے، سیاست ہماری جمہوریت ہے اور معیشت ہماری سوشلزم'' ہے کی نفی کرتا تھا کو ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں اس وقت دکان پر دوسرے احرار رضا کاروں کے ساتھ موجود تھا جب کالج کے لڑکوں نے حملہ کیا اور وہ بینر جو شاہ جی کی دکان پر لٹکا ہوا تھا اس کو اتارا گیا۔ یہ پانچ چھے سو کے قریب پیپلز پارٹی کے چھوکرے تھے جو پہلے تو شاہ جی کے سامنے بھنگڑا ڈالتے رہے، نعرہ بازی کرتے رہے اور پھر وہ بینر چھین لے گئے لیکن ایک احرار کارکن محمد اسمٰعیل جس کو عرف عام میں مفتی کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دکان سے اترا اور اس نے حیران کن پھرتی کے ساتھ وہ بینر واپس چھین کر دکان پر لگا دیا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا جلوس شاہ جی کی دکان سے گزر گیا لیکن کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ شاہ جی کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بار بار خیال آتا کہ چند احرار رضا کاروں اور محسن شاہ صاحب کی یہ جرأت کہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوئے تو سمجھ میں یہی آیا کہ جو اللہ کی بات کرتے ہیں اللہ اُن کی مدد بھی کرتا ہے۔ ورنہ جلوس سے پہلے دکان پر حملہ اور اس پر احرار رضا کار کی جوابی کارروائی

اور شاہ صاحب کا دکان کا کھلا رکھنا اور بھٹو کے اتنے بڑے جلوس کا شاہ جی کو کچھ کہے بغیر گزر جانا سمجھ سے باہر تھا۔ اسی طرح شہر کے پرانے اشترا کیوں کا ملتان میں ہنگامہ آرائی کرنا۔ ایک اشترا کی ملک عطاء اللہ کی دکان کو آگ لگانا اور قرآن پاک کا شہید ہونا اور پھر اس ساری ہنگامہ آرائی کا سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لینا اور بھٹو کی سیاسی قوت کے بل بوتے پر احرار کے خلاف ایک گھناؤنی سازش اور مہم کا شروع کرنا اور اس کے مقابلے میں مولانا سید عطاء المحسن بخاری اور مولانا سید عطاء المؤمن بخاری کا دلیرانہ کردار یہ ایک الگ داستان ہے:

اک جنوں کی داستاں ہے داستاں احرار کی
عزم و ہمّت، سرفروشی، ولولہ، ایثار کی
جابجا لکھی ہوئی ہے تاریخ کے اوراق پر
خونچکاں سی اک کہانی لشکرِ احرار کی

ان آٹھ برسوں میں جماعت احرار کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا، کس کس کہانی کو دہرایا جائے۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے کہ مولانا احتشام الحق تھانوی نے ملتان بار روم میں تقریر کی۔ وہاں پر سید عطاء المحسن شاہ صاحب بھی تقریر سننے چلے گئے۔ مولانا نے تقریر کے بعد شاہ صاحب سے ملاقات کی اور رات کو عید گاہ میں منعقد ہونے والے جلسے جس سے مولانا احتشام الحق نے خطاب کرنا تھا میں شریک ہونے کی شاہ صاحب کو دعوت دی۔ شاہ صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ رات کو جلسے کے دوران نعرہ بازی کی گئی، سوشلزم زندہ باد کے نعرے لگائے گئے، سانپ سانپ کا شور مچا کر لوگوں کو خوفزدہ کیا اور جلسہ منتشر کرنے کی کوشش اور زبردست ہنگامہ آرائی کی گئی۔ مولانا احتشام الحق تقریر چھوڑ کر اٹھ کر جانے لگے تو محسن شاہ صاحب نے ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ:

''مولانا یا تو مجھے آپ نے بلانا نہیں تھا اور اگر میں آپ کی دعوت پر آ گیا ہوں تو اب آپ جا نہیں سکتے۔ خطاب آپ کا ضرور ہوگا۔''

سید عطاء المحسن بخاری صاحب نے نہایت شرافت سے ہنگامہ کرنے والوں کو پُر امن رہنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر آپ فریقِ مخالف کے جلسے میں آ گئے ہیں تو سننے کا بھی حوصلہ رکھیں۔ اس کے بعد کہا کہ اگر دس منٹ تک خاموشی اختیار نہ کی گئی تو جوابی کارروائی ہوگی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ فضا سازگار ہوگئی اور مولانا احتشام الحق صاحب کا دوبارہ خطاب ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ جوابی طور پر شہر میں جگہ جگہ سید عطاء المحسن شاہ صاحب کے بارے میں کہا گیا وہ نہ تو میں بیان کر سکتا ہوں اور نہ ہی آپ اسے پڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ احرار اسلام کے راستے میں رکاوٹیں تھیں جن کو ایک ایک کر کے احرار نے اپنے راستے سے ہٹایا اور کارواں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف قائد احرار حضرت مولانا سید ابوذر بخاری کا کردار کیا تھا۔ اس کے بارے میں رفیق اختر صاحب نقیبِ ختمِ

نبوّت کے ابوذر بخاری نمبر کے صفحہ ۱۹۶ پر تحریر کرتے ہیں:

’’مولانا مفتی محمود صاحب اور شاہ جی کے اختلاف کی بازگشت دینی حلقوں میں اکثر سنائی دیتی تھی۔ ایک روز عصر کے بعد مدرسہ قاسم العلوم کے ایک مولوی صاحب دفتر میں شاہ جی سے ملنے آئے اور ہدیہ پیش کرنے کے بعد بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ مختصر تعارف کا بعد گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو مولوی صاحب نے شاہ جی کی مذمت میں مولانا مفتی محمود صاحب کی کوئی گفتگو سنانی شروع کر دی۔ تھوڑی سی خاموشی کے بعد شاہ جی نے بڑے جلال آمیز انداز میں ہدیہ واپس کرتے ہوئے ان مولوی صاحب سے کہا کہ میرا یقین ہے کہ مفتی صاحب جیسا انسان میرے بارے میں ایسے کلمات نہیں کہہ سکتا۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔‘‘

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ ہوا۔ آغا شورش کاشمیری ایوب دور حکومت میں چٹان میں قادیانیوں کے خلاف ایک پرزور اداریہ لکھنے کی وجہ سے گرفتار ہو گئے۔ لیکن پورے ملک کے میں اس پر خاموشی طاری تھی۔ بڑی بڑی دینی جماعتیں مہر بہ لب تھیں۔ مجلس احرار اسلام فیصلہ کیا کہ اس خطرناک خاموشی کو توڑنا چاہیے ورنہ تو مستقبل میں قادیانیوں کے خلاف کچھ کہنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اس پر مزید معاملہ اور آگے بڑھا کہ حکومت وقت کے وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ نامی نے قادیانیوں کے حق میں ایک بیان داغ دیا جو اخباروں میں چھپا۔ بیان تھا کہ: ’’قادیانی مسلمان ہیں اُن کے خلاف کسی ایسی کارروائی کو برداشت نہیں کیا جائے گا جو ملک کے اندر انتشار کا باعث بنے۔‘‘ ایسے میں مجلس احرار نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں موچی دروازہ کے میدان میں شورش کاشمیری کی رہائی اور حکومت کے خلاف اس گرفتاری پر ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا جائے۔ اس جلسے کے لیے اشتہارات شائع کیے گئے جو ملک بھر میں مجلس احرار کی شاخوں کے ذریعے لگوا دیے گئے۔ جلسے کے لیے زبردست تیاری کی گئی تا کہ یہ خطرناک جمود توڑا جائے۔ میں بھی اس جلسے میں شرکت کے لیے لاہور پہنچا۔ شام سے ذرا بعد میں دفتر بیرون دہلی دروازہ گیا تو میں نے دیکھا کہ مولانا سید ابوذر بخاریؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ، صدر مرکزیہ مولانا عبید اللہ احرارؒ، چودھری ثناء اللہ بھٹہؒ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ موضوع زیر غور یہ تھا کہ جلسہ کا اعلان اور تشہیر تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر تقریریں سخت نہ ہوں تو ایسی صورت حال میں جلسہ کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا اور اگر سخت تقریروں کا نوٹس لیتے ہوئے حکومت نے احرار ہائی کمان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا تو پھر جماعتی کام متاثر ہوگا۔ لہٰذا کیا کیا جائے۔ اس پر ابھی بات جاری تھی کہ خاموش بیٹھے ماسٹر تاج الدین نصاری (اللہ اُنھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے) سید ابوذر بخاریؒ سے مخاطب ہو کر بولے:

’’شاہ جی آپ کس مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ بھلا احرار کب اتنے وسائل والے تھے جو آج اتنے وسائل والے نہیں۔ جلسہ ہوگا اور تقریریں سخت ہونی چاہییں۔ حکومت چاہتی ہے کہ قادیانیوں کا نام کوئی نہ لے

اور حکومت کے ارادے بھی خطرناک ہیں۔وزیر داخلہ کا بیان واضح طور پر اس امر کی دلیل ہے۔لہٰذا تقریریں سخت ہونی چاہئیں۔اوّل تو کچھ نہیں ہوگا اور پھر اگر کچھ ہوا بھی تو دیکھا جائے گا۔یہ بعد کی بات ہے۔''

بس پھر کیا تھا فیصلہ ہوا کہ تقریریں سخت ہوں گی۔ چنانچہ جلسہ میں سب سے پہلی تقریر چودھری ثناء اللہ بھٹہ مرحوم کی ہوئی۔انھوں نے انتہائی سخت الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔حکومت کی قادیانیت نوازی پر تنقید کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا گیا کہ آغا شورش کی گرفتاری اور اس کے بعد وزیر داخلہ کا قادیانیوں کے حق میں بیان یہ جماعت احرار کو ایک چیلنج ہے۔ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں ہم پورے ملک میں عوام کو اتنا بیدار کردیں گے کہ حکومت کو قادیانیت نوازی کی حکمت عملی ترک کرنی پڑے گی۔

مولانا عبیداللہ احرار صدر مرکز یہ آئے اور انھوں نے تقریر کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا ایک فقرہ تو مجھے بھولتا ہی نہیں ہے۔انھوں نے کہا:

''او قاضی فضل اللہ تیری رگوں میں اگر کسی حلال زادے کا خون گردش کر رہا ہے تو آ موچی دروازے وہی بات کہہ جو تو نے اخبارات کو پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہی ہے کہ قادیانی مسلمان ہیں۔ تجھے پتہ چل جائے گا کہ تیرے منہ میں دانت کتنے نہیں۔احرار تمھاری زندگی تنگ کرکے رکھ دیں گے۔اس ملک میں قادیانیت نوازی نہیں چلے گی کہ یہ ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے۔''

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے ہوئے اس اوباش عورت کا قصہ بیان کیا جو کسی جنگل میں ایک شریف شخص سے جس کے سر پر بستر، ایک ہاتھ میں لوٹا وضو کے لیے اور دوسرے ہاتھ نماز پڑھنے کے لیے جانماز تھی۔اُسے کہنے لگی کہ تو، تو مجھے چھیڑے گا۔اس شریف آدمی نے کہا کہ اے احمق عورت میں تجھے کیسے چھیڑ سکتا ہوں میرے دونوں ہاتھ مصروف ہیں سر پہ بستر ہے۔کہنے لگی کہ تو بستر زمین پر بچھا دے گا، لوٹا زمین پر رکھ دے گا اور جانماز بھی زمین پر رکھ دے گا اور پھر مجھے چھیڑے گا۔حکومت کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔یہ اس اوباش عورت کی طرح احرار کو خواہ مخواہ اپنی طرف راغب کر رہی ہے حالانکہ ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے۔حکومت کو احساس ہونا چاہیے کہ اوباش عورت کا کردار ادا نہ کرے حکومتوں سے ٹکرانا ہماری روایت ہے۔شورش کو فوری طور پر رہا کرو اور قاضی فضل اللہ کو قادیانیت نوازی کی بنیاد پر وزارت داخلہ سے معزول کرو۔احرار پورے ملک کے اندر قادیانیوں کے خلاف تقریریں کرکے حکومت کو اپنے مطالبات منوانے پر مجبور کردیں گے۔

سب سے آخر میں مولانا سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو ایسی زبردست تقریر کی کہ عوام کا جوش و جذبہ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔نعرۂ تکبیر، ختمِ نبوّت اور احرار اسلام زندہ باد سے پنڈال گونج اٹھا۔ بہر حال جلسہ بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا۔احرار کے اس جلسے نے فضا ہی تبدیل کردی اور پھر پورے ملک میں اسی عنوان پر احرار کے علاوہ دوسری دینی تنظیموں کے اجتماعات بھی ہوئے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ تحریکِ ختمِ نبوّت دوبارہ شروع ہوگئی ہے۔حکومت کو آغا شورش کاشمیری کو رہا کرنا

پڑا۔ یاد رہے کہ آغا صاحب کی یہ قید اور رہائی اس رہائی سے پہلے کی بات ہے کہ جب وہ کراچی میں پچاس روز تک بھوک ہڑتال کر کے رہا ہوئے تھے اور کراچی سے لے کر لاہور تک ان کا فقید المثال استقبال ہوا تھا۔

آل پاکستان احرار کانفرنس لاہور ۱۹۷۰:

مارچ ۱۹۷۰ء میں لاہور میں آل پاکستان احرار کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کی تیاری کے لیے کافی عرصہ پہلے کام شروع کر دیا گیا تھا۔ دہلی دروازے سے لے کر موچی دروازے تک مختلف شہروں سے آئے ہوئے احرار رضا کاروں کے خیمے تھے جو ایک عجیب سماں پیش کر رہے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر ایک جگہ مولانا عبید اللہ احرار صدر مرکزیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے احرار کا پرچم لہرایا۔ احرار رضا کار سرخ وردی میں ملبوس اپنے اپنے خیمے کے باہر کھڑے پرچم احرار کو سلامی دے رہے تھے۔ پرچم کے نیچے احرار رہنما ایک جگہ پر کھڑے تھے۔ پرچم کشائی کی اس تقریب کے بعد سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خصوصی دعا کے ساتھ جلوس کی صورت میں پورے شہر کے بازاروں کا ایک چکر لگانے کا حکم دیا۔ یہ سماں دیکھ کر مجھے مجلس احرار اسلام کی وہ ’’دفاع پاکستان کانفرنس‘‘ یاد آ گئی جو ۱۹۴۹ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ جس میں مجلس احرار اسلام نے انتخابی سیاست سے علیحدہ ہونے اور دینی محاذ پر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد آج اس کانفرنس میں بھی وہی شان وشوکت وہی ولولہ وہی جوش وخروش دیکھنے میں آیا۔ ہزاروں کی تعداد میں احرار رضا کاروں نے احرار رہنماؤں کی قیادت میں اس جلوس میں شرکت کرتے ہوئے لاہور شہر کی معروف سڑکوں پر اسلام زندہ باد، سوشلزم مردہ باد کے نعروں سے فضا میں نیا جوش وخروش، نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ جہاں جہاں سے احرار کے اس جلوس نے گزرنا تھا شہریوں نے اپنے خرچہ پر وہاں استقبالی دروازے بنائے، اُنہیں خوبصورت جھنڈیوں اور بینروں سے سجایا گیا تھا۔ احرار رضا کاروں کی تواضع کے لیے مختلف مقامات پر مشروب پلانے کا اہتمام کیا گیا۔ رضا کاروں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ دکانداروں نے کھڑے ہو کر جلوس کا استقبال کیا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے یہ جلوس لاہور کی سڑکوں پر مارچ کرتا رہا۔ اسلام زندہ باد، سوشلزم مردہ باد، ختمِ نبوّت زندہ باد، شہداءِ ختمِ نبوّت زندہ باد، احرار اسلام زندہ باد، امیر شریعت زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے۔ تقریباً چودہ پندرہ میل کا سفر احرار رضا کاروں نے پیدل مارچ کر کے پورا کیا۔ شام کے وقت موچی دروازے کے قریب جب احرار اسلام کا جلوس پہنچا تو پیپلز پارٹی کے کچھ شیدائیوں نے جلوس پر حملہ بھی کیا۔ جسے احرار رضا کاروں نے جوابی کارروائی کر کے پسپا کر دیا اور معاملہ کنٹرول کر لیا گیا۔ جاتے ہوئے پیپلز پارٹی کے جیالے کہہ گئے کہ ہم رات کو آپ کے جلسہ پر حملہ کریں گے۔ لیکن ساری رات دہلی دروازے کے باہر وسیع وعریض پنڈال میں سردار عبدالقیوم خان جو آزاد کشمیر کے پہلے صدر تھے کی صدارت میں احرار کا یہ جلسہ ہوتا رہا کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ احرار کے جلسے کے قریب آتے۔ حملہ تو خیر دور کی بات تھی۔ احرار رہنماؤں کے علاوہ آغا شورش کاشمیری نے جلسے سے خطاب کیا۔ سب سے اہم تقریر سید ابوذر بخاری کی تھی جو صبح کی اذان تک جاری رہی۔ یہاں پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ سید ابوذر بخاری نے تین آدمیوں کا ایک وفد ترتیب دیا۔ جس میں سید عطاء المحسن شاہ صاحب کے علاوہ میں بھی شامل تھا

اور گوجرانوالہ کے ایک اہم کارکن صوفی محمد سلیم صاحب بھی تھے۔ہم تینوں کو ابوذر بخاری صاحب نے کہا کہ مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا محمد اکرم صاحب (سلطان فونڈری والے) کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں قیام پذیر ہیں اُنھیں مل کر کانفرنس کے رات کے اجلاس میں خطاب کرنے کی دعوت دو۔ چنانچہ ہم سید عطاء المحسن شاہ صاحب کی قیادت میں وہاں اس کارخانے پہنچے جہاں پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قیام پذیر تھے اور وہاں اُن کے میزبانوں سے ملاقات کی، انھوں نے ہماری چائے سے تواضع کی۔ہم نے آنے کا مدعا بیان کیا، کہنے لگے مفتی صاحب ابھی آرام فرما رہے ہیں آپ ذرا ٹھہریں۔ان سے مل کر بات کرتے ہیں لیکن ہم تینوں کافی دیر تک وہاں بیٹھے مولانا کا انتظار کرتے رہے۔مولانا تشریف نہ لائے اور نہ ہی اُن سے ملاقات ہوئی۔ہم اپنے مشن میں ناکام واپس آئے اور ساری کہانی سید ابوذر بخاری صاحب سے کہہ دی۔شاہ جی نے کہا کہ میری خواہش تو یہ تھی کہ وہ ہماری اس کانفرنس میں آتے اور ان کے خطاب سے ہم مستفیض ہوتے لیکن انھوں نے شاید ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ہماری طرف سے توحجت تمام ہوئی۔اس کانفرنس میں اتنی زیادہ تعداد میں رضا کاروں کی شرکت دیکھ کر لوگ حیران ہو گئے تھے۔طویل مدت کے بعد بھی لوگوں میں احرار اسلام سے تعاون اور ان کے نصب العین سے اتفاق کرنے والے اور ان کا استقبال اتنے وسیع پیمانے پر کرنے والے ابھی تک ہیں۔ایسے معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے لوگ احرار کے لیے اداس تھے اور انھیں اس صورت میں دیکھنے کے لیے جیسے ترس گئے ہوں۔احرار اسلام کے لیے یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی دیکھا جائے تو نو دس سال کی جبری پابندی اور پھر ۱۹۶۲ء سے نامساعد حالات میں جماعت احرار کی تشکیل نو اور پھر ۱۹۷۰ء تک یہ سفر اور سفر میں پیش آنے والے حالات و واقعات جو کسی بھی طرح جماعت کے لیے حوصلہ افزا نہ تھے بلکہ حوصلہ شکن تھے۔یہ کانفرنس احرار اسلام کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس پر ہمارے تمام رہنما اور رضا کار اسے محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھتے تھے اور اس کامیاب کانفرنس پر اللہ شکر ادا کرتے ہوئے اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو گئے۔میں بھی اس عظیم الشان کانفرنس میں شرکت کے بعد بہاول پور آ گیا۔جہاں اُن دنوں میں اپنی سرکاری نوکری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

ایک دن مولانا سید عطاء المؤمن بخاری صاحب میرے پاس بہاول پور آ گئے۔میں بہت خوش ہوا، تمام دن ہم اکٹھے اپنے گھر میں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ خالد شبیر آج ایک خاص کام کے لیے بہاول پور آیا ہوں۔میں نے پوچھا کہ وہ خاص کام کیا ہے؟ کہنے لگے ابھی نہیں بتاؤں گا۔شام کو بتاؤں گا۔شام ہوئی تو شاہ صاحب نے مجھے کہا کہ شام کی نماز ماڈل ٹاؤن کی اس مسجد میں پڑھنی ہے جہاں پر مولانا شمس الحق افغانی صاحب درس دیتے ہیں اور جمعہ بھی پڑھاتے ہیں۔میں تیار ہو گیا چنانچہ ہم دونوں نے مغرب کی نماز اُسی مسجد میں پڑھی۔نماز کی امامت بھی حضرت مولانا شمس الحق افغانی نے کرائی، نماز سے فارغ ہوئے تو سید عطاء المؤمن صاحب آگے بڑھے اور مولانا سے مصافحہ و سلام کیا۔مولانا نے شاہ جی سے پوچھا کہ آج کیسے آنا ہوا؟ جواب میں شاہ صاحب نے کہا کہ آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا حاضر ہو گئے۔میرا تعارف بھی شاہ صاحب نے ہی مولانا سے کرایا۔مولانا ہم دونوں کو اپنے حجرے جو مسجد کے ساتھ ہی وابستہ تھا لے گئے اور

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا ایک چھابے میں چند روٹیاں اور ایک چھوٹی سی کٹوری (برتن) میں سالن لے کر آئے، دسترخوان پر دونوں چیزیں رکھ دیں اور کہا کہ جو تھا حاضر خدمت ہے۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا اور یہ اعزاز بھی حاصل کیا کہ ہم نے حضرت کے گھر کا نمک کھایا ہوا ہے۔ اس دوران مومن شاہ صاحب نے چند باتیں حالات حاضرہ کے حوالے سے مولانا سے پوچھیں۔ ان کا پہلا سوال تھا کہ مولانا مفتی محمود صاحب جو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے ہیں (ان دنوں مولانا مفتی محمود صاحب ولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کے اشتراک سے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تھے) آپ کا کیا خیال ہے اس سے ملک کے اندر تحریک اسلامی کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا یا کچھ اس کی تقویت کا باعث بنے گی؟

حضرت مولانا شمس الحق افغانی نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''شاہ جی اس سے اسلامی تحریک کو کیا فائدہ ہوگا، ولی خان کے بارے میں ایک بات یاد رہے آگ سے اس کی تپش جدا ہوسکتی ہے لیکن ولی خان سے دین دشمنی جدا نہیں ہوسکتی۔ اس کے باپ میں تو اتنی دینی غیرت تھی کہ راہ چلتے کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تو سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کے ماتھے پر رکھ لیتا تھا، ولی خان کو تو اللہ تعالیٰ نے اتنی توفیق بھی نہیں دی۔ ان لوگوں کے اشتراک سے بھلا تحریک اسلامی کو کیا تقویت حاصل ہوگی۔ اور مولانا مفتی محمود اُن سے دین کے لیے کیا کام لے سکتے ہیں۔''

بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ مولانا افغانی نے درست فرمایا تھا۔ پھر مفتی محمود صاحب کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن کو ولی خان کے مقابلے میں الیکشن میں آنا پڑا اور مولانا حسن جان شہید نے ولی خان کو بھاری اکثریت سے شکست دی۔ اس کے علاوہ شاہ جی اور مولانا شمس الحق افغانی کے درمیان مزید کچھ گفتگو بھی ہوئی۔ جس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جیسے دین کے بارے میں کوئی شاگرد اپنے استاد سے کچھ پوچھتا ہے۔ تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ بات چیت ہوئی پھر اُن سے اجازت لے کر ہم دونوں واپس آ گئے۔ دوسرے دن عطاء المؤمن شاہ صاحب تو واپس چلے گئے لیکن میں یہی سوچتا رہا کہ عطاء المؤمن شاہ صاحب کے لیے حضرت شمس الحق افغانی جو ان دنوں میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں شیخ الجامعہ تھے، سے شرف ملاقات کتنا اہم کام تھا جس کے لیے اُنھیں ملتان سے بہاول پور کا سفر کرنا پڑا۔

مولانا شمس الحق افغانی جیسے لوگ صرف پیدا ہوتے ہیں مرتے نہیں ہیں، ان سے ملاقات اور استفادے کی جو سعادت ہمیں حاصل ہوئی وہ ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی، سوائے اُن کے جن پر اللہ تعالیٰ کرم کرتا ہے۔ اس ملاقات کو یاد کرتا ہوں تو یہ شعر ذہن پر وارد ہوتے ہیں:

زندہ ہیں وہی بالیقین آج بھی ۔۔۔ مرنے کے بعد ہو گئے جو اور معتبر
خالدؔ وہ میری روح میں جیسے اُتر گیا ۔۔۔ کہتے ہیں جس کی داستاں میرے یہ اشکِ تر

جاری ہے